چاہے وہ عوام ہوں یا خواص، علمائے قانون ہوں یا وکیل اور جج ہوں قانونی معاملات میں اپنی آراء و افکار کے مطابق فیصلہ کرنے کی صلاحیت باقی نہیں رہ جاتی، بلکہ سب قانون کے پابند ہوجاتے ہیں، بالکل اسی طرح علماء و مفکرین اسلام کے اجماع یا شبہ اجماع یا اکثریت سے کسی بھی مسئلے کو مان لینے کے بعد اس مسئلے کو ماننا تمام امت پر واجب ہوگا۔

کوئی صاحب یہ اعتراض نہ کریں کہ علمائے اسلام کا اجماع کسی معاملہ میں ہو ہی نہیں پاتا، کیونکہ قانونی اور فقہی چیزوں میں اختلاف علم و تفقہ کی دلیل بھی ہے اور تفکیر انسانی کا شاہکار بھی ہے، اسلامی شریعت کے علاوہ بھی دنیا میں کوئی ایسا قانون موجود نہیں جس میں کسی نہ کسی قانون دان، وکیل یا جج کو اختلاف نہ ہو، اس لئے اختلافات کا ہونا کوئی غیر فطری بات نہیں اور نہ یہ اسلامی قانون کے اجراء میں تعویق کا سبب بن سکتے، کیونکہ علمائے امت کا اصولی طور پر یہ متفق علیہ فیصلہ ہے کہ اسلامی قانون نافذ ہو، اور پھر قانونی طور پر اختلافاتِ فقہیہ کے باوجود علمائے حق کی اکثریت کا کیا ہوا فیصلہ، قانونی مسائل میں نافذ ہوسکتا ہے اور جمہوریت کے اس دور میں علمائے حق میں سے اکثریت کی رائے معلوم کرنی مشکل کام نہیں ہے، یہ فیصلہ قانونی اشیاء ہی میں ضروری بھی ہے۔

(۳) اگر دوسرے مذاہب فقہ کے باشندے ملک میں موجود ہوں اور ان کے علماء کی اکثریت دوسرے مذاہب فقہ سے تلفیق کے حق میں نہ ہو۔ تو گو بظاہر یہ انتہائی افسوسناک بات ہوگی۔ لیکن مذہبی حریت اور تفکیری آزادی کی خاطر یہ بھی کیا جاسکتا ہے کہ ہر مذہب فقہ کے ماننے اور چاہنے والے کے لیے قانونی اعتبار سے فیصلے اسی کی فقہ کے مطابق ہوں، ایسا کرنے میں نہ کوئی عقلی قباحت ہے اور نہ کوئی شرعی مانع۔ میرے نزدیک پہلی صورت مستحسن ہے اور اسلامی وحدت کی رو سے بھی اچھی ہے لیکن حریت کے تقاضوں کے پیش نظر اس دوسری چیز کے ماننے میں بھی مجھے ہرگز انکار نہیں، لیکن قانون میں پھر یہ تصریح بے حد ضروری کہ کوئی بھی وہ گروہ جو صرف اپنی فقہ کی روشنی میں فیصلہ چاہے گا، اسے کسی بھی مسئلے کے حل کے لئے کسی دوسرے مکتب فقہ سے اخذ کرنے کی مطلق اجازت نہ ہوگی اور اس کے سارے تصفیے اسی مذہب کے

اقوال کی روشنی میں حل کیے جائیں گے چاہے ان میں کتنی ہی مشکل اور سختی ہو۔

۷۔ جہاں مسلمان اقلیت میں ہیں وہاں کی وطنی حکومتوں کے لئے بھی اپنی جمہوریت کو تولنے کا وقت اور امتحان ہے کہ غیر وطنی اور سامراجی حکومتیں جب مسلم پرسنل لا میں تداخل نہ کرسکیں تو آئین جہانبانی اور دستور فطرت کے مطابق ہر عقیدے اور مذہب والے کو اس کے عقیدے اور اعمال میں جو حریت کی ضمانت دی گئی ہے وہ وطنی حکومتیں اس طرح پوری کرسکتی ہیں کہ سامراجی عہد حکومت میں مسلمانوں کے غصب کئے ہوئے حقوق واپس کریں اور اگر وہ یہ نہیں کرسکتیں تو کم از کم ان حقوق اور قوانین ہی کو باقی رہنے دیں جنھیں غیر وطنی حکومت نے باقی رکھا تھا، اور خصوصی طور پر اسلامی عائلی قوانین، کیونکہ یوں تو اسلام کا ہر قانون اپنی جگہ پر اٹل اور مستحکم ہے، لیکن بعض قوانین وہ ہیں جو مسلمانوں کے اقتدار اور اسلامی حکومت ہی میں نافذ ہوسکتے ہیں، جیسے قصاص، حدود، اسلامی تعزیرات وغیرہ، اور بعض دوسرے قوانین وہ ہیں جو ہر خطۂ حکومت کے ماتحت ہوں یا اقلیت میں ہوں یا کسی بھی سیکولر اسٹیٹ میں رہتے ہوں، جیسے عبادات، اخلاقیات اور وہ اجتماعی اور عائلی قوانین جن کی رو سے حرام وحلال کی حدود متعین ہوتی ہیں۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ کسی مذہب کا پیرو کسی بھی وضعی قانون کی رو سے حلال یا حرام کی ہوئی کسی چیز کو اپنا لے یا چھوڑ دے، کیونکہ مذہب کی حلال کی ہوئی چیزیں اس کے نزدیک حلال ہیں اور مذہب کی حرام کردہ اشیاء اس کے نزدیک حرام ہیں، اس کا وجدان وضمیر اور قلب ونظر اس کے علاوہ کسی دوسری بات کو ماننے سے انکار کرتے ہیں اور قانونی طور پر اگر اس کو منوا بھی لیا جائے تو گویا وہ ایک حرام کام کا مرتکب ہوگا۔ مثال کے طور پر وضعی قانون میراث میں سے کسی وارث کو ایک حق دلاتا ہے لیکن شرعی طور پر اس کا حصہ کم ہے یا وہ وارث ہی نہیں ہے تو یہ مال اس شخص کے لیے حرام ہوگا، اور حرام مال کھانے والے کا پیٹ آگ کا ایندھن بنے گا، دوسری مثال یہ کہ طلاق اسلامی طریقہ ہے، اگر قانون کسی مطلقہ جوڑے کے لئے یہ فیصلہ کرے کہ تمہاری طلاق نہیں ہوئی ہے، لیکن شریعت کا فیصلہ یہ ہو کہ ہوگئی ہے تو اب دونوں میاں بیوی فحش کاری اور زنا کے مرتکب ہوں

گے، اور اصرار کے ساتھ عمل کرنے اور توبہ کی طرف رجوع نہ ہونے کی صورت میں زنا کار بھی خدا کی لعنت کا مستحق ٹھہرے گا۔ اس لیے اسلام کا عائلی قانون صرف اجتماعی اور سوشل قانون ہی نہیں بلکہ عقائد وعبادات کا ایک جزو ہے اور اس کی خلاف ورزی کی صورت میں گناہ ہوتا ہے، اس لئے کسی بھی آزاد ملک میں رہنے والا مسلمان شخص یہ کس طرح برداشت کرسکتا ہے کہ حکومت چاہے وہ اسلامی ہو یا سیکولر ہو اس کے عقائد وعبادات، قلب و وجدان، ضمیر و باطن اور حرام وحلال کے معاملات میں دخل اندازی کرے۔

۷۔ جہاں مسلمان اقلیت میں ہیں، وہاں بھی ان پر کسی نام نہاد اسلامی ملک میں کسی تبدیلی وتغیر کے قانون سے ان پر مطلق کوئی اثر نہیں پڑتا کیونکہ جیسا کہ پہلے لکھ چکا ہوں قانون سازی اسلام میں صرف خدا کا حق ہے اور انسان کتاب وسنت و اجماع کی روشنی میں خدا کے احکامات کا استنباط کرتا ہے۔ اسلامی قانون کے ماخذوں میں کہیں یہ نہیں لکھا ہوا ہے کہ کسی اسلامی حاکم یا اسلامی ملک کا غیر اسلامی قانون بھی حجت بن سکتا ہے، بلکہ اس کے بالمقابل صاف صاف یہ اعلان ہے کہ "خدا کی معصیت میں کسی انسان کی اطاعت جائز ہی نہیں ہے"، اقلیت میں بسنے والے مسلمانوں کے پاس بھی براہ راست کتاب وسنت موجود ہے، وہاں بھی علماء وفقہاء پائے جاتے ہیں، اور وہ براہ راست احکام کا استنباط شریعت کے اصولوں کی روشنی میں کرسکتے ہیں جو مشکلات حیات پر قابو پانے کی پوری صلاحیت رکھتے ہوں۔

۸۔ مسلمان اقلیت کے لئے یہ حجت بھی بالکل غیر شرعی ہے کہ ملک کی غیر مسلم اکثریت نے اپنا مذہبی عائلی قانون بدل کر اس کی جگہ وضعی اور مدنی قانون شادی بیاہ اور میراث وغیرہ میں قبول کرلیا ہے، اس لیے اس ملک کی مسلم اقلیت کو بھی اسے قبول کرلینا چاہیئے، کیونکہ اکثریت اس معاملہ میں آزاد ہے اس کا جو جی چاہے کرے لیکن اقلیت کے حقوق کو چھیننے کا وہ حق نہیں رکھتی، دوسری بات یہ کہ شاید اکثریت کے مذہب اور اس کے بانیوں اور مقننوں نے اس کی اجازت اپنے پیروؤں کو دی ہو کہ تم قانونِ عائلی میں تبدیلی کرسکتے ہو، لیکن شرع اسلام نے صاف صاف یہ حکم دیا ہے کہ یہ حدودِ الٰہیہ

ہیں ان سے آگے نہ بڑھنا اورکسی قسم کی غیر شرعی تبدیلی کے مجاز ہی تم نہیں ہو، اس لیے کسی انسانی قانون ساز کو کبھی یہ جرأت نہ ہو کہ وہ خدا کے مقرر کردہ احکام و قوانین کو بدلے، تیسری عقلی بات یہ کہ اسلام کے عائلی قوانین مسلمان کی نظر میں سارے وضعی قوانین سے بہتر ہیں اور عدل وعدالت دونوں اپنے اندر رکھتے ہیں (یعنی کسی ایک خاص شخص کے کیس میں بھی انصاف کرتے ہیں اور عام فطری اصولوں کی رو سے بھی ہر پیش آنے والے قضیے میں حق و انصاف کی رعایت کرتے ہیں)، اور اس طرح زمانے کے تقاضوں کا ساتھ دینے کی پوری صلاحیت رکھتے ہیں، چوتھی بات یہ کہ کسی غیر مسلم کی نظر میں یہ قوانین نعوذ باللہ ظالمانہ ہوں یا زمانہ کا ساتھ دینے کی صلاحیت نہ رکھتے ہوں تو قطع نظر اس کے کہ یہ بات عقل و منطق، تاریخ و تجربہ کے خلاف ہے، پھر بھی ہم یہی کہیں گے کہ سوسائٹی میں بہت سے دوسرے ظالمانہ مسائل ہیں آپ براہ مہربانی ان کی طرف توجہ دیں، اور ہمارے مسائل کو ہمارے لئے چھوڑ دیں، کیونکہ جب ملت اسلامیہ ان مفروضہ نقصانات کو بخوشدلی برداشت کرنے کے لئے راضی ہے تو پھر یہ پرانی مثل صادق آتی ہے کہ جب میاں بیوی راضی تو پھر کیا کریں قاضی۔

۹۔ قوانین اسلامیہ کے سلسلے میں کتاب وسنت سے اجتہاد کے لئے علمائے امت ہی کی رائے وقیع ہو سکتی ہے۔ جبری احکام یا جلسوں جلوسوں اور ووٹنگ کے ذریعہ اس قسم کی قانونی باتیں طے نہیں ہو سکتیں۔ اگر کسی ملک کے چور یا رشوت خور، یا بلیک مارکیٹنگ کے دلدادے اور اخلاق باختگی پر فریفتہ دیوانے کسی شہر میں جلسہ کریں اور ووٹنگ سے یہ پاس کرا دیں کہ یہ اخلاقی اور قانونی برائیاں، برائیاں نہیں بلکہ اچھائیاں ہیں، اور عیب نہیں بلکہ ہنر ہیں، تو کیا مقنن ان کی ہرزہ سرائی کو برداشت کرے گا، اور اگر کسی دوسرے ملک یا قانون سے یہ حجت بھی پیش کر دیں کہ وہاں بلیک کی عام اجازت ہے، یا فلاں بابلی قانون میں اور فلاں ماڈرن سوسائٹی میں کنوارپن اور عفت وعصمت عیب سمجھے جاتے ہیں اور حرام کاری، بے حیائی اور عیاشی ہنر اور فیشن ہے، تو کیا یہ بات کسی دوسرے اخلاق وایمان سے آشنا ملک کے مقنن کے لئے نظیر کا کام دے سکتی ہے؟

۱۰۔ جہاں مسلمان اقلیت میں ہیں وہاں کی حکومتیں اگر اسلامی حکومتوں کی تقلید ہی کرنا چاہتی ہیں تو اچھی باتوں میں کرنی چاہئے، مثال کے طور پر اکثر اسلامی ملکوں میں پرسنل لا میں مطلق تبدیلی نہیں ہوئی ہے اور بعض ملکوں میں شریعت کے پورے قوانین نافذ ہیں جن میں دیوانی و فوجداری سب شامل ہیں، اور بعض ممالک میں شریعت اسلامیہ کے مطابق سارے قوانین ڈھالنے کے اعلان ہو چکے ہیں، کہیں اسکیمیں تیار ہیں یا پھر یہ کہ مسلم ملکوں میں اقلیتوں مثلاً یہودی اور مسیحی حضرات کا پرسنل لا اب تک محفوظ ہے اور کسی قسم کی تبدیلی اور ترمیم اس میں نہیں کی گئی ہے، اس لیے وہ جمہوری ممالک جہاں مسلمان اقلیت میں ہیں انھیں اسلامی ممالک کے اس عظیم قانونی و اخلاقی کردار کی روشنی میں سوچنا چاہئے جو وہ اپنی محکوم اقلیتوں کے ساتھ کرتے ہیں، یا پھر ہندوستان کی ساڑھے آٹھ سو سالہ تاریخ تقنین پر نظر رکھی جاسکتی ہے جس میں کہیں بھی غیر مسلموں کے پرسنل اور عائلی قوانین، حتی کہ عادات و رسوم تک کو ہاتھ نہ لگایا گیا تھا، یا پھر عباسی، اموی اور اندلس کی تاریخ قانون سے بھی یہ چیزیں معلوم کی جاسکتی ہیں۔

۱۱۔ کیا ٹرکی کے لیے یہ بات افسوس اور محرومی کی نہیں ہے کہ شریعت میں جو تبدیلیاں سامراجی اور مسیحی حکومتیں نہ کرسکیں وہ اس نے کیں اور جس ٹرکی نے چھ سو برس تک اسلامی اقدار کی حفاظت کی تھی وہی آج ان اقدار کو لوٹنے والا قزاق بن گیا؟

اور کیا یہ شرم و عار کا مقام نہیں کہ ٹرکی کے بنائے ہوئے عائلی قوانین یہودی ملک اسرائیل اور مسیحی ملک لبنان کے مسلم باشندوں پر نافذ ہیں، اور ٹرکی کی مسلم سوسائٹی اس سے محروم کردی گئی ہے؟ اور سیکولر ہندوستان میں انگریزوں کے زمانے میں بنایا ہوا مسلم پرسنل لا آج بھی نافذ اور جاری ہے؟ اور بعض اسلامی ملک ان قوانین کی تبدیلی کی ناکام ہی سہی لیکن کوششوں میں لگے ہوئے ہیں؟ اور کیا سب سے بڑھ کر ستم یہ نہیں کہ ان نام نہاد اسلامی حکومتوں کے اقوال و اعمال و کردار کو حجت بناکر اس کی روشنی میں مسلم اقلیتوں کے اسلامی پرسنل لا میں تبدیلی کی باتیں غیر اسلامی ممالک میں سوچی جاتی ہیں اور ان کو حجت بناکر پیش کیا جاتا ہے، اور اس طرح اقلیتوں کی محافظ، غم گسار

اور سہارا بننے کے بجائے مسلم حکومتیں اور ان کے اعمال اقلیتوں کی محرومی اور دل شکنی کا باعث بنتے رہتے ہیں۔ (یہ بات پہلے لکھی جا چکی ہے کہ ان کے اعمال اور غیر اسلامی قوانین کسی کے لئے بھی حجت نہیں بن سکتے۔)

۱۲۔ تمام غیر مسلم اور قدیم قومیں اپنا رشتہ اپنے ماضی سے اور اپنے ناقابل عمل قانونی ورثہ سے جوڑنا چاہتی ہیں اور اسے فخر سمجھتی ہیں، اور عصر حاضر کے مطابق نہ ہونے کی صورت میں اس میں طرح طرح کی تاویلات کرتی ہیں، بلکہ یوں کہئے کہ پاپڑ بیلتی ہیں، کیا مسلم اقوام کی بیداری کا وقت اب بھی نہیں آیا ہے؟ اَلَمْ یَاْنِ لِلَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْ تَخْشَعَ قُلُوْبُهُمْ لِذِكْرِ اللّٰهِ وَمَا نَزَلَ مِنَ الْحَقِّ (حدید - ۱۶) ترجمہ "کیا ایمان والوں کے لئے (اب بھی وہ) وقت نہیں آگیا کہ ان کے دل ذکر الٰہی سے خشوع حاصل کریں، اور اس سے جو (دین) حق (خدا کی طرف سے) نازل ہوا ہے" کیا انھیں اپنے قدیم اور دائمی آسمانی حقائق سے آگہی نہیں حاصل کرنی چاہئے؟ کیا انھیں اپنے تہذیبی ورثہ کی طرف نہیں لوٹنا چاہئے؟ کیا دنیا میں پیدا شدہ مسائل کا ازلی حل اور ابدی علاج جس اسلامی قانون میں موجود ہے کیا اس کو مکمل طور سے اپنانے کی سعی اخلاص و ایمان کے ساتھ انھیں نہیں کرنا چاہئے؟ اور اس طرح الجھنوں میں گھری ہوئی انسانیت کو مشکلات کے حل کرنے کا فطری طریقہ نہیں نہیں سکھانا چاہئے؟ اور کیا خدا کے بخشے ہوئے نور اور سلامتی کی راہ کا پرچار انھیں اقوام عالم کی حیرانیوں اور گم کردہ راہ پگڈنڈیوں کے سامنے نہیں کرنا چاہئے؟ اور اقوام عالم کے لئے خدا کی دی ہوئی اس ندا سے ان کے گوش آشنا نہیں کرنا چاہئے۔ قَدْ جَآءَكُمْ مِّنَ اللّٰهِ نُوْرٌ وَّكِتٰبٌ مُّبِيْنٌ، يَّهْدِيْ بِهِ اللّٰهُ مَنِ اتَّبَعَ رِضْوَانَهٗ سُبُلَ السَّلٰمِ وَيُخْرِجُهُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ بِاِذْنِهٖ وَيَهْدِيْهِمْ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ (مائدہ ۵ - ۱۵-۱۶) ترجمہ "تحقیق آگیا تمھارے پاس (تمھارے) اللہ کی طرف سے نور اور روشن و واضح کتاب، اس کے ذریعہ اللہ ہدایت دیتا ہے جو اس کی رضا کا تابع ہو، سلامتی کی راہوں کی، اور نکالتا ہے ان کو زندگی کے اندھیروں میں سے روشنی کی طرف، اپنے حکم سے، اور انھیں سیدھی راہ کی ہدایت کرتا ہے۔"

بہرحال مختصر سے اس مضمون میں ہم نے تفصیل کے ساتھ دونوں سوالوں کا جواب دیدیا ہے، آخر میں اختصار کے ساتھ اتنا اور کہنا چاہتے ہیں کہ یہ دونوں سوال فطری، عقلی، بدیہی اور قانونی وشرعی کسی بھی اعتبار سے صحیح نہیں ہیں، کیونکہ یہ ایک حقیقت ہے کہ کسی بھی شخص یا قوم کا غیر آئینی عمل کسی بھی دوسرے شخص یا قوم کے لئے آئینی حجت نہیں بن سکتا، اور اسی طرح کسی شخص کے پیٹ میں اگر درد ہو تو یہ اس بات کے لئے دلیل نہیں بن سکتا کہ کسی نہ کسی طرح اس کے سر میں بھی درد پیدا کیا جائے، یا اگر کسی ایکسیڈنٹ میں یا کسی ظالم وجابر غیر ملکی فرمانروا کے تشدد کی وجہ سے کسی شخص کی ایک آنکھ پھوٹ گئی ہے تو اس کو اس بات کی سند نہیں بنایا جاسکتا کہ ضرور اس کی دوسری آنکھ، ناک، کان، ہاتھ، پیر اور دوسرے اعضاء بھی تلف کیے جائیں۔ اس طرح کی منطق نہ صرف یہ کہ نادانی اور لاعلمی سے تعبیر کی جائے گی بلکہ شاید کوئی بھی صحیح الدماغ انسان اس قسم کی ہرزہ سرائی کی جرأت نہیں کرسکتا، وہ صرف یہی کہے گا کہ فوراً آپریشن کے ذریعہ اس کی آنکھ ٹھیک کرنے کی پوری کوشش کی جائے، اور اگر خدانخواستہ وہ ٹھیک نہ ہوسکے تو اس کی دوسری آنکھ کی مکمل نگہداشت، حفاظت اور نگرانی کی جائے کہ کہیں اس کو مزید نقصان نہ پہنچ جائے۔ یہ بات عقلی طور پر کتنی ناقابل تسلیم اور مضحکہ خیز ہے کہ اگر کسی چور یا غاصب نے آپ کی گھڑی چرالی ہے یا غیر قانونی طور پر آپ کی زمین ضبط کرلی ہے تو کوئی دوسرا ساہوکار یا ہمدرد ملک کے قانون ساز ادارے یا عدالت سے یہ مطالبہ کرے کہ ان کے گھر کا سارا ساز وسامان چرالے جانے اور ان کے سارے مکانات، دکانیں اور زمینیں بھی ضبط کرنے کا قانونی حق عطا کیا جائے، یا یہ بات کس قدر عبرتناک حد تک نادانی ہوگی، اگر کوئی شخص یہ مطالبہ شروع کردے کہ چونکہ ظالم وغاصب سامراج کی قانونی عدالت یا غیر قانونی حکومت نے فلاں ملک کے فلاں وزیر اعظم یا قومی رہنماؤں کے خلاف جیل کی سزائیں دی تھیں اور ان میں سے کسی نے سولہ برس، کسی نے سولہ مہینے اور کسی نے سولہ دن ہی سہی جیل کی مشقتیں برداشت کی تھیں، اس لیے اب سامراج کے چلے جانے کے بعد ان سارے قومی رہنماؤں تک کو جیل دی جائے جن کو سامراجی حکومت

نے جیل کی سزا نہیں دی تھی اور دوسری طرف وہ رہنما جن کو سامراج کی عدالتوں نے سزائیں دی تھیں ان کو آزادی کے بعد بھی وزارت و امارت کی کرسیوں سے ہٹا کر دوبارہ جیل کی کوٹھڑیوں میں فوراً بند کر دیا جائے، اس قسم کی باتیں نہ صرف یہ کہ نادانی سے تعبیر کی جائیں گی بلکہ اگر کوئی ایسی بات کہے تو اسے ڈاکٹری معائنہ کے بعد یا تو پاگل خانے بھجوا دیا جائے گا یا پھر عدالت کے کٹہرے میں کھڑا کیا جائے گا اور جیل بھجوا دیا جائے گا۔

لیکن طرفہ تماشا یا ستم ظریفی کی انتہا یہ ہے کہ اسلامیات یا پرسنل لا کے سلسلے میں اس قسم کی باتیں کرنے کا نام ایسا معلوم ہوتا ہے کہ عقلمندی، روشن خیالی، دانائی، فیشن، ہنر، ریسرچ اور علم و تحقیق پڑ گیا ہے۔ بہرحال اس قسم کی غیر آئینی، غیر علمی، غیر عقلی، غیر فطری اور غیر شرعی باتیں کرنے والوں کے حق میں بھی ہم صرف دعا ہی کر سکتے ہیں، کہ اے فیاض ازل حکمت و شعور اور عقل و دانائی کی دولت انھیں نصیب فرما، اور قانون اسلامی کی خوبیوں کو سمجھنے کی بصیرت ان میں پیدا فرما، اور حقیقی اسلام کی چاشنی سے ان کے کام و دہن آشنا بنا تاکہ وہ مسلمان ہو کر اور مسلمانوں جیسے نام رکھ کر اسلام کو نقصان نہ پہنچائیں بلکہ تیرے دین کے سچے خدمتگذار بن جائیں، اور غیر اللہ اور طاغوت کی قانونی بالادستی کے بھی منکر ہو جائیں، اور دلوں سے مغربی و مشرقی غیر اسلامی افکار، اقدار اور تہذیب کی محبت بھی نکل جائے کہ اسلامی قانون کو بروئے کار لانے میں یہی سب سے بڑی رکاوٹ ہے، لیکن اسلام کے سیل رواں اور اسلام کی روشنی کے سامنے اس کی حقیقت کچھ بھی نہیں ہے، اور اب وہ وقت قریب آچکا ہے جب اسلامی ملکوں میں اسلام کا شمس تاباں پوری درخشانی کے ساتھ طلوع ہونے والا ہے اور باطل کے سارے گھروندے خس و خاشاک بن کر بہہ جائیں گے یا خاکستر ہو جائیں گے کیونکہ ان کی حقیقت مکڑی کے جالوں سے زیادہ نہیں ہے

مَثَلُ الَّذِينَ اتَّخَذُوا مِن دُونِ اللَّهِ أَوْلِيَاءَ كَمَثَلِ الْعَنكَبُوتِ اتَّخَذَتْ بَيْتًا وَإِنَّ أَوْهَنَ الْبُيُوتِ لَبَيْتُ الْعَنكَبُوتِ لَوْ كَانُوا يَعْلَمُونَ إِنَّ اللَّهَ يَعْلَمُ مَا يَدْعُونَ مِن دُونِهِ مِن شَيْءٍ وَهُوَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ وَتِلْكَ الْأَمْثَالُ نَضْرِبُهَا لِلنَّاسِ وَمَا يَعْقِلُهَا إِلَّا الْعَالِمُونَ (عنکبوت ۴۱-۴۳)

ترجمہ: "ان لوگوں کی مثال جو اللہ کے سوا اولیاء (محبوب، مددگار، شریک، حمایتی) دوسروں کو بناتے ہیں، ان کی مثال مکڑی کی طرح ہے کہ اس نے ایک گھر بنایا اور سب سے کمزور گھر مکڑی کا گھر ہے، اگر وہ سمجھتے، اللہ جانتا ہے جس کو پکارتے ہیں اس کے سوا کوئی چیز بھی، اور وہ زبردست حکمتوں والا ہے، اور یہ مثالیں (اور کہاوتیں) ہم لوگوں کے (فائدے) کے لئے بیان کرتے ہیں، اور ان کو سمجھتے (بوجھتے) وہی ہیں جو جاننے والے (سمجھدار) ہیں۔

عربی لٹریچر میں قدیم ہندوستان

تالیف: جناب ڈاکٹر خورشید احمد فارق پروفیسر عربی دلی یونیورسٹی

اردو زبان میں پرانے ہندوستان کے تمدن، مذہب اور علوم کے بارے میں اب تک عربی تحریروں کا تفصیلی، تحقیقی اور تنقیدی جائزہ نہیں لیا گیا تھا۔ تھوڑا بہت اگر کچھ ہوا بھی تھا تو اس کی حیثیت ادھورے غلط تراجم اور خلاصوں تک ہی محدود تھی۔ اس کتاب میں ڈاکٹر صاحب موصوف نے اہتمام کے ساتھ پرانے ہندوستان (سلطان محمود غزنوی سے پہلے) یعنی نویں، دسویں صدی عیسوی میں ہندستان کے مذہب، تمدن، علوم، تاریخ اور تجارت وغیرہ سے متعلق امور کا عرب مؤلفین کی تحریروں اور بیانات کی روشنی میں تعارف کرایا ہے۔ ہندی عبارتوں میں ہندی نام جو مسخ و محرف ہو گئے تھے تاریخی شہادتوں، قرائن اور ممکن طریقوں سے تصحیح بھی فرمائی ہے۔ صفحات ۳۲۶ - قیمت -/۱۱

ملنے کا پتہ: ندوۃ المصنفین، اردو بازار، دہلی ۶

علامہ اقبال اور اسلامی ثقافت
کے
اصل الاصول کی ترجمانی

(از جناب بشیر احمد خاں صاحب غوری سابق رجسٹرار امتحانات عربی و فارسی اتر پردیش)

اسلامی ثقافت یا "مسلم کلچر" عامۂ اہل اسلام کے نقطۂ نظر سے ان کے انداز زندگی کا نام ہے، جسے اگر منطقی بنیادوں پر متعین کیا جائے تو اس چیز کے مترادف قرار پاتا ہے، جسے قرآن "دین" کا نام دیتا ہے۔

مگر علامہ اقبال کے نزدیک "اسلامی ثقافت" اُن علوم بالخصوص علوم عقلیہ کا مصداق ہے جو مسلمانوں کی تفکیری سرگرمیوں کے نتیجے میں ظہور پذیر ہوئے۔ ویسے وہ بھی اصولی طور پر اس کا ماخذ قرآن اور اُس کی تعلیمات ہی کو بتاتے ہیں۔

اس قرآن اور اس کی تعلیمات کے بارے میں علامہ کا خیال ہے کہ:

"بنیادی طور پر قرآن کی روح کلاسیکیت بیزار (یونان بیزار) ہے"

دوسری جگہ فرماتے ہیں:

"یہ وہ چیز ہے جسے قرآن کے ابتدائی طالب علموں نے کلاسیکی قیاس آرائی کے زیر اثر پورے طور پر نظر انداز کر دیا۔ وہ قرآن کو یونانی فکر کی روشنی میں پڑھتے اور سمجھتے

تھے۔ انھیں اس حقیقت تک پہونچنے میں کہ قرآن کی روح حقیقی طور پر کلاسیکیت بیزار (یونان بیزار) ہے، دو سو سال لگے۔"

علامہ نے اس مزعومہ واقعہ کو ایک بنیادی تاریخی حقیقت سمجھنے پر اصرار کیا۔ لہذا ایک اور مقام پر فرمایا:

"اس حقیقت کو نہ سمجھتے ہوئے کہ قرآن کی روح حقیقی طور پر کلاسیکیت بیزار (یونان بیزار) ہے، اور یونانی مفکرین پر پورا اعتماد کرتے ہوئے اُن (مسلمان مفکرین) میں پہلا رجحان اور میلان یہ پیدا ہوا کہ قرآن کو یونانی فلسفہ کی روشنی میں سمجھیں۔"

انھوں نے اس مزعومہ "یونان پسندی" اور "یونان بیزاری" کے درمیان تاریخی طور پر تحدید کی بھی کوشش کی ہے کہ "یونان پسندی" کا یہ رجحان مسلمانوں میں دو سو سال تک رہا، جس کی وجہ سے عمل پسند عرب کوئی علمی ترقی نہ کر سکے۔ فرماتے ہیں:

"واقعہ یہ ہے کہ یونانیوں کے اثر نے .... اس کے برخلاف مسلمانوں کے تصور قرآن کو دھندلا اور غیر واضح رکھا اور کم و بیش دو سو سال تک عمل پسند فعّال عربوں کے مزاج کو اپنے اظہار و تحقق کا موقعہ نہیں دیا۔"

اس اصرار بیجا کا نتیجہ تھا کہ انھوں نے اسلامی ثقافت کو یونانی علوم کی افادیت سے مسلمانوں کی مایوسی کا نتیجہ قرار دیا۔ فرماتے ہیں:

"اس بات کے پیش نظر کہ قرآن کی روح ٹھوس واقعات سے اعتنا کرنا ہے اور اور یونانی فلسفہ کی حقیقت قیاس آرائی ہے جو نظریات تراشی میں مگن رہتا ہے اور حقائق و واقعات سے بے اعتنائی برتتا ہے، اس کوشش کا نتیجہ ناکامی کے سوا اور کیا ہو سکتا تھا اور اس ناکامی کے نتیجہ میں اسلامی ثقافت کی حقیقی روح منصۂ شہود پر جلوہ گر ہوئی۔"

لہٰذا علامہ کے نزدیک مختلف اسلامی علوم (بالخصوص علوم عقلیہ) کی ترقی یونانی فکر کے

خلاف مسلمان مفکرین کی ذہنی بغاوت کا نتیجہ تھی۔ اس "ذہنی بغاوت" کی تفصیل میں فرماتے ہیں:

"یونانی فلسفہ کے خلاف اس عقلی بغاوت کا اظہار فکر کے جملہ شعبوں میں ہوا۔ مجھے اندیشہ ہے کہ میں اس بات کی کماحقہ تفصیل کا اہل نہ ہو سکوں گا کہ ریاضی و ہیئت اور طب میں اس کا ظہور کس طرح ہوا۔ یہ اشاعرہ کی مابعد الطبیعی تفکر میں بالکل واضح ہے۔ لیکن اس سے بھی زیادہ وضاحت کے ساتھ اُس تنقید میں عیاں ہے، جس کے ساتھ مسلمانوں نے یونانی منطق پر تبصرہ کیا۔"

آخر میں علامہ نے ریاضیات کے اندر مسلمانوں کی سرگرمیوں کے بارے میں حسب ذیل تبصرہ سپرد قلم فرمایا ہے:

"جہاں تک ریاضیات کا تعلق ہے، یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ بطلیموس (۸۷ - ۱۶۵ء) کے زمانہ سے نصیر الدین طوسی (۱۲۰۱ - ۱۲۷۴ء) کے زمانہ تک کسی نے بھی ان دقتوں کی طرف سنجیدگی سے غور نہیں کیا جو (اصول) اقلیدس کے خطوط متوازی کے مصادرے کی صحت کو مکانی حسی کی بنیاد پر ثابت کرنے میں مضمر ہیں۔ یہ (محقق) طوسی ہی کی ذات تھی، جس نے اس سکون میں جو ہزار سال سے دنیائے ریاضیات پر طاری تھا، تلاطم برپا کیا، محقق طوسی نے اس مصادرہ کی اصلاح کی کوشش میں مکان کے حسی تصور کے ترک کرنے کی ضرورت کا احساس کیا۔ اس طرح انھوں نے فضائے کثیر الجہات کی تحریک کے لئے، ہر چند کہ وہ کتنی ہی معمولی کیوں نہ ہو، بنیاد فراہم کی۔"

لیکن علامہ کی عظمت فکر کے باب میں ادب و احترام کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑتے ہوئے بھی ہم اس احساس حقیقت کے لئے مجبور ہیں کہ یہ افادات محل نظر ہیں۔

۱) قرآنی تعلیمات کی روح کا تعین قرآن کی تعلیمات کی روح یا اصل الاصول کو متعین کرنے کی کوشش ہمارے مصلحین کی قیاس آرائیوں کا بڑا دلچسپ موضوع رہی ہے علامہ اقبال بھی اس روش عام پر چلے بغیر نہ رہ سکے اور انھوں نے اسے "یونان بیزاری میں مغز

سمجھ لیا، چنانچہ خطبات میں فرماتے ہیں:

"بنیادی طور پر قرآن کی روح کلاسیکیت بیزار (یونان بیزار) ہے"

لیکن خود قرآن حکیم کی تصریحات کی رو سے "قرآن کی روح" "یونان پسندی" اور "یونان بیزاری" دونوں سے بالاتر ہے۔ "اسلامی تعلیمات" کے مطابق یہ "توحید ربوبیت" چنانچہ حسب تصریح قرآن مجید منشائے تخلیق انسان صرف "عبادت الہٰی" ہے۔

وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنْسَ إِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ (ذاریات - ۵۶)

[اور میں نے جن اور انس کو اسی واسطے پیدا کیا ہے کہ میری عبادت کیا کریں]

اور اسی مقصد کے تحقق کے لئے بار بار انبیاء کرام کی بعثت ظہور میں آئی، چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

"وَمَا أَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَسُوْلٍ إِلَّا نُوْحِيْ إِلَيْهِ أَنَّهُ لَا إِلٰهَ إِلَّا أَنَا فَاعْبُدُوْنِ۔"

(الانبیاء - ۲۵)

[اور ہم نے آپ سے پہلے کوئی ایسا پیغمبر نہیں بھیجا جس کے پاس ہم نے یہ وحی نہ بھیجی ہو کہ میرے سوا کوئی معبود (ہونے کے لائق) نہیں ہے۔ پس میری ہی عبادت کیا کرو۔]

خود شارع علیہ السلام نے "دعائم اسلام" کو جو اس کے رکن رکین اور مبنیٰ علیہ ہیں، حدیث مشہور میں متعین فرمادیا ہے۔ ان میں اولین حیثیت "ایمان باللہ" کی ہے،

"بنی الاسلام علی خمس: شهادة ان لا اله الا الله و ان محمداً عبده و رسوله واقام الصلوة وایتاء الزکوة والحج وصوم رمضان۔"

[اسلام کی بنیاد پانچ چیزوں پر ہے: اس بات کی شہادت کہ اللہ کے سوا اور کوئی معبود نہیں اور یہ کہ محمدؐ اس کے بندے اور رسول ہیں، نماز کا قائم کرنا، زکوٰۃ کا ادا کرنا، حج اور رمضان کے روزے]

اور اسی "توحید ربوبیت" کے مقدس فریضہ کی ادائیگی کے لئے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم تیغ بکف ہونے

تک کے لئے مامور ہیں۔

"اُمِرْتُ اَنْ اُقَاتِلَ النَّاسَ حَتّٰی یَقُوْلُوْا لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ۔"

[مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں لوگوں سے اس وقت تک لڑتا رہوں جب تک وہ یہ نہ کہیں کہ اللہ کے سوا اور کوئی معبود نہیں۔]

لیکن علامہ نے اسپنگلر کی تقلید میں اسے "یونان بیزاری" میں منحصر کر دیا۔ اسپنگلر نے جدید یورپی ثقافت کا اصل الاصول "یونان بیزاری" (کلاسیکی انداز فکر سے انحراف کلی) بتایا ہے، چنانچہ وہ "انحلال الغرب" میں لکھتا ہے:

"اور اب پہلی مرتبہ کلاسیکی اور مغربی (جدید یورپی تہذیب کی) روحوں کے مابین بنیادی تضاد کا پورے طور پر اندازہ لگانا ممکن ہو سکا ہے۔ تاریخ کے پورے پس منظر میں جو بے شمار شدید اور گہرے تعلقات پر مشتمل ہے، دو اور چیزیں اساسی طور پر ایک دوسرے سے اتنی مختلف نہیں ہیں جتنی کہ یہ دونوں (یونانی کلاسیکی تہذیب اور جدید یورپی تہذیب)۔"

علامہ اقبال کا بھی، جو اصولی طور پر جدید یورپی اور اسلامی ثقافتوں کو ایک ہی سمجھتے ہیں، بلکہ متقدم الذکر کو موخر الذکر کا تسلسل قرار دیتے ہیں، اصرار ہے کہ اسپنگلر نے یورپی ثقافت کے جو مخصوص (یعنی یونان بیزاری اور زمانہ کے حقیقی ہونے کا شدید شعور) بتائے ہیں، انھیں اسلام کے اندر بھی خواہی نخواہی ثابت کیا جائے۔ خواہ تاریخ اور قرآن کے مطالعہ سے ان کی تائید ہوتی ہو یا نہ ہوتی ہو۔

غرض قرآن کی روح کے "یونان بیزار" ہونے کا مفروضہ علامہ کے تجدد پسند ذہن کی اختراع ہے اور جب انھیں اس کی تائید میں اسلامی ادب کے اندر کوئی دلیل نہ مل سکی، تو پھر انھوں نے تحکمیت و ادعائیت کا سہارا لیا اور ادعائی طور پر فرما دیا:

"بنیادی طور پر قرآن کی روح کلاسیکیت بیزار (یونان بیزار) ہے۔"

(۲) اسلام میں یونان پسندی اور یونان بیزاری کی تاریخی طور پر حد بندی کا مفروضہ | علامہ کی تفکیری سرگرمیوں کا

سب سے تکلیف دہ پہلو یہ ہے کہ ان کے بنیادی مقدمات اکثر حالات میں ان کے تجدد پسند ذہن کی اختراع ہوتے ہیں، جن کا حقیقت سے دور کا بھی واسطہ نہیں ہوتا۔ مگر وہ انھیں کمال ادعائیت و تحکمیت کے ساتھ مسلمات بلکہ "بدیہی علوم متعارفہ" بناکر پیش کرتے ہیں۔ پھر ان ادعائی مسلمات پر قیاس آرائیوں کی ایک فلک بوس عمارت قائم کرتے ہیں، جس کا انجام

خشت اول چوں نہد معمار کج
تا ثریا می رود دیوار کج

کا مصداق ثابت ہوتا ہے۔

چنانچہ مثال بالا میں انھوں نے جس وجہ سے بھی ہو، قرآن کی روح کلاسیکیت بیزاری" (یونان بیزاری) کو قرار دے لیا تاکہ جدید یورپی تہذیب کو اسلامی ثقافت کا خوشہ چین ثابت کرسکیں، حالانکہ قرآن مجید اور اسلام کی بنیادی تعلیمات سے کسی طرح بھی اُن کے اس اختراع ذہنی کی تائید نہیں ہوتی۔ مگر علامہ اسے ایک حقیقت نفس الامری سمجھنے پر مصر ہیں۔

اس کے بعد وہ قیاس آرائیوں کا ایک سلسلہ شروع کر دیتے ہیں، جس کا آغاز اس دعوے سے فرماتے ہیں کہ مسلمانوں نے دو سو سال تک اس مزعومہ روح قرآن (کلاسیکیت بیزاری) کے علی الرغم "یونان پسندی" کو اپنایا، حتیٰ کہ قرآن کو بھی یونانی فلسفہ کی روشنی میں سمجھنے کی کوشش کی۔ چنانچہ وہ فرماتے ہیں:

"یہ وہ چیز ہے جسے قرآن کے ابتدائی طالب علموں نے کلاسیکی قیاس آرائی کے زیر اثر پورے طور پر نظر انداز کر دیا۔ وہ قرآن کو یونانی فکر کی روشنی میں پڑھتے اور سمجھتے تھے۔ انھیں اس حقیقت تک پہونچنے میں کہ قرآن کی روح حقیقتاً کلاسیکیت بیزار ہے، دو سو سال لگے۔"

اس قسم کی گلفشانیاں اگر تجدد پسندان روزگار میں سے کوئی اور صاحب فرماتے تو چنداں تعجب نہ ہوتا کیونکہ جدید کی ممارست نے انھیں اس قابل ہی نہیں چھوڑا کہ قدیم کا حقیقت پسندانہ

ادراک کرسکیں۔ لیکن جب یہ چیزیں اُس عبقری وقت کے قلم سے نکلتی ہیں جس نے اپنی خداداد صلاحیتوں کا بہترین حصہ "ایران میں مابعد الطبیعیات کا ارتقار" کے عنوان سے اسلام کی فکری تحریکوں کا مطالعہ کرنے میں صرف کیا تھا، تو ہماری حیرت کی انتہا نہیں رہتی۔ بہرحال

(الف) نہ تو مسلمانوں نے قرآن فہمی کا آغاز یونانی فلسفہ کی روشنی میں کیا، جو دوسو سال کی سعی لاحاصل کے بعد انھیں اپنی ناکامی کا احساس ہوا ہو۔ اور

(ب) نہ یہ بات ہی صحیح ہے کہ دوسو سال تک "یونان پسندی" مسلمانوں کی تفکیری سرگرمیوں کا رہنما اصول رہی اور اس کے بعد انھوں نے "یونان بیزاری" کو اپنا شعار بنایا۔

مزید تفصیل حسب ذیل ہے :

(الف) مسلمانوں میں قرآن فہمی کا آغاز نزول قرآن ہی کے ساتھ ہوا، چنانچہ قرآن بار بار رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اقدس کو "تعلیم کتاب وحکمت" کے فریضہ کی بجاآوری کے ساتھ متصف کرتا ہے :

"يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ آيَاتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ"

[جو ان کو اللہ کی آیتیں پڑھ پڑھ کر سناتے ہیں اور اُن کو (عقائد باطلہ و اخلاق ذمیمہ سے) پاک کرتے ہیں اور ان کو کتاب (قرآن) اور حکمت (دانشمندی کی باتیں) سکھاتے ہیں]

پھر جس نہج پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے صحابہ کو قرآن سمجھایا، اسی نہج پر موخرالذکر نے تابعین کو، تابعین نے تبع تابعین کو اور آخرالذکر نے اپنے بعد آنے والے علماء کو۔

غرض دوسو سال تک مسلمانوں نے قرآن کو صرف "تعلیم نبوت" ہی کی روشنی میں سمجھا اور یہ بات اظہر من الشمس ہے کہ صحابہ و تابعین اور تبع تابعین میں سے کوئی بھی طبقہ یونانی فلسفہ سے آشنا نہ تھا، قرآن فہمی کے لئے اُس سے استمداد و استعانت کا تو سوال ہی کیا۔ پھر بعثت اسلام سے دوسو سال بعد تک یونانی فلسفہ اسلامی معاشرہ میں مروج بھی نہیں ہوا تھا۔ اُس کی باقاعدہ ترویج تیسری صدی ہجری سے شروع ہوتی ہے۔

غرض علامہ کی یہ قیاس آرائی قطعاً بے بنیاد ہے کہ مسلمانوں نے دوسو سال تک قرآن کو یونانی فلسفے کی روشنی میں سمجھنے کی کوشش کی۔

(ب) جہاں تک مسلمانوں کی فکری تاریخ میں "یونان پسندی" اور "یونان بیزاری" کے رجحانات کی تاریخی طور پر تحدید کا تعلق ہے، علامہ کی یہ قیاس آرائی بھی صحیح نہیں ہے کہ اول الذکر مسلمانوں میں دوسو سال تک رائج رہی اور اس کے بعد موخر الذکر (یونان بیزاری) کا رواج ہوا۔

واقعہ یہ ہے کہ اسلامی فکر میں یہ دونوں تحریکیں بیک وقت چلتی رہی ہیں اور زمانی طور پر ان کے درمیان خطِ فاصل کھینچنا ایک لایعنی بات ہے۔ یونانی فلسفہ کے رواج کے بعد اس کے متعلق مفکرینِ اسلام کے دو موقف تھے اور یہ دونوں بیک وقت ظہور میں آئے۔

بعض لوگوں نے اُن مسائل کو جو اسلام کی تعلیمات سے متصادم تھے، باطل کرنے کی کوشش کی۔ یہ لوگ "متکلمین" تھے اور ان کی فکری سرگرمیاں "علم کلام" کہلاتی ہیں۔ اقبال کی اصطلاح میں یہ گویا "ANTI - CLASSICALISM" کا رجحان تھا۔

لیکن کچھ اور لوگ تھے جنھوں نے فلسفہ کی دلکشی سے مسحور ہوکر یونانی فلسفہ کی روشنی میں اسلامی تعلیمات کی تاویل و توجیہ پر اصرار کیا۔ یہ لوگ "فلاسفۂ اسلام" یا "حکمائے اسلام" کہلائے۔ اقبال کی اصطلاح میں گویا یہ "CLASSICALISM" کی تحریک تھی۔

اس کے بعد ان دونوں تحریکوں کے نمایندوں میں ایک مسلسل کشمکش شروع ہوئی جس سے اسلامی فکر کی ثروت میں بیش بہا اضافہ ہوا۔ چنانچہ علامہ تفتازانی نے لکھا ہے:

ثم لما نقلت الفلسفة عن اليونانية الى العربية خاض فيها الاسلاميون وحاولوا الرد على الفلاسفة فيما خالفوا فيه الشريعة فخلطوا بالكلام كثيراً من الفلسفة لتحققوا	پھر جب فلسفہ یونانی زبان سے عربی زبان میں منتقل ہوا تو مسلمانوں نے اس میں غور و خوض کیا اور جن مسائل میں فلاسفہ نے شریعت سے اختلاف کیا تھا انھوں نے اس کی تردید کا ارادہ کیا۔ اس

مقاصدها فیتمکنوا من ابطالها۔
(شرح عقائد نسفی صفحہ ۶)

طرح فلسفہ کے بہت سے مسائل علم کلام کے ساتھ ملا دیے تاکہ وہ ان کے مقاصد کی تحقیق کر سکیں اور اس طرح ان کے ابطال پر قادر ہو سکیں۔

غرض یہ دونوں تحریکیں جنھیں مروجہ اصطلاح میں "کلام" اور "فلسفہ" کہا جاتا ہے اور علامہ کی اصطلاح میں "کلاسیکیت بیزاری" اور "کلاسیکیت پسندی" کہنا چاہیئے، بیک وقت ظہور میں آئیں اور نہ صرف دو سو سال تک بلکہ تقریباً ایک ہزار سال تک ایک دوسرے کے دوش بدوش چلتی رہیں۔ مگر اس کی تفصیل ایک مستقل پیش کش کی مقتضی ہے۔

بہرحال علامہ کی مزعومہ حد بندی کے دو سو سال تک مسلمانوں میں "یونان پسندی" کی تحریک کو فروغ حاصل رہا اور اس کے بعد "یونان بیزاری" کی تحریک کو، یہ محض ان کے اپنے ذہن کی اختراع ہے، جس کا حقیقت سے دور کا بھی واسطہ نہیں۔

علامہ نے اپنے مزعومہ فکری انقلاب [یعنی یونان پسندی کی تحریک کے بجائے "یونان بیزاری" کی تحریک کے رواج] کی توجیہ کے باب میں بھی ٹھوس تاریخی شہادتوں کے بجائے ذہنی اختراع کا سہارا لیا ہے۔ انھوں نے یہ مفروضہ تراشا ہے کہ اس انقلاب کا سبب علمی بے اطمینانی تھا۔ فرماتے ہیں:

> "اس بات کے پیش نظر کہ قرآن کی روح ٹھوس واقعات سے اعتنا کرتا ہے اور یونانی فلسفہ کی حقیقت قیاس آرائی ہے جو نظریات تراشی میں مگن رہتا ہے اور حقائق و واقعات سے بے اعتنائی برتتا ہے، اس کوشش کا نتیجہ ناکامی کے سوا اور کیا ہو سکتا تھا اور اس ناکامی کے نتیجے میں اسلامی ثقافت کی حقیقی روح منصۂ شہود پر جلوہ گر ہوئی۔"

حالانکہ اصل وجہ سیاسی تھی۔ فلسفہ نے مسلمانوں میں آتے ہی اسلام دشمن اعدامیوں اور تخریب کاروں کے ساتھ گٹھ جوڑ کر لیا اور اگلی صدی میں وہ باطنی دہریت کا رکن رکین بن گیا۔ چنانچہ ڈیلی نے اسی (باطنی مذہب) کے بارے میں لکھا ہے:

"واتفق اھل المقالات ان اول من اسس ھذا المذھب المشئوم قوم من اولاد المجوس وبقایا الخرمیۃ والفلاسفۃ والیھود" (قواعد عقائد آل محمد صفحہ ۳۱)

مقالات نویسوں کا اتفاق ہے کہ جن لوگوں نے سب سے پہلے اس مذہب مشئوم کی بنیاد ڈالی، وہ مجوس کی اولاد، خرمی مذہب کے بچے کھچے لوگ فلاسفہ اور یہود تھے۔

خود فاطمی خلیفہ عبید اللہ بن الحسن القیروانی نے سلیمان بن سعید الجنابی کو لکھا تھا:

واذا ظفرت بالفلسفی فاحتفظ بہ فعلی الفلاسفۃ معولنا وانا وایاھم مجمعون (الفرق بین الفرق صفحہ ۱۷۷)

اور اگر تمہیں کوئی فلسفی مل جائے تو اس پر ہوشیاری سے نظر رکھو، کیونکہ فلاسفہ ہی پر ہمارا اعتماد ہے اور ہم اور وہ باہم متفق ہیں۔

اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ تفلسف ان اسلام دشمن تحریکوں کا امتیازی شعار بن گیا۔ لہٰذا حکمراں طبقہ کے ساتھ ساتھ امن پسند شہریوں کا بھی اس کی طرف سے چوکنا، بلکہ بیزار ہو جانا فطری تھا۔ اس وجہ سے فلسفہ، علوم الاوائل اور یونان پسندی عوام وخواص ہر جگہ مبغوض ہو گئی، چنانچہ برنی نے لکھا ہے کہ کہ سید نور الدین مبارک سلطان التمش کے دربار میں وعظ کے اندر فلاسفہ کی مخالفت میں فرمایا کرتے تھے:

"فلاسفہ وعلوم فلاسفہ ومعتقدات معقولات فلاسفہ را در بلاد ممالک خود بودن نگزارند وعلوم فلسفہ را سبق گفتن بای وجہ کان روا ندارند"

اور یہ فلسفہ بیزاری کچھ عہد التمش کے ساتھ مخصوص نہ تھی، بلکہ ممالیک دہلی نے اس روایت کو اپنے غوری وغزنوی پیشروؤں سے ورثہ میں پایا تھا۔

(۳) اسلامی علوم کی ترقی میں یونان بیزاری کی کارفرمائی کا مفروضہ

دین اسلام اور اسلامی ثقافت کا اصل الاصول "توحید ربوبیت" ہے جو مرد مومن کو محض ایجابی طور پر ہی عبادت الٰہی کے لئے مامور نہیں کرتا کہ

لَآ اِلٰہَ اِلَّآ اَنَا فَاعْبُدُوْنِ

[میرے سوا کوئی معبود ہونے کے لائق نہیں۔ پس میری ہی عبادت کیا کرو]

بلکہ بالتصریح غیر اللہ کی عبادت کی بھی ممانعت کرتا ہے :

"وَقَضٰى رَبُّكَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِيَّاهُ"

[اور تیرے رب نے حکم کر دیا ہے کہ بجز اس کے کسی اور کی عبادت مت کرو]

بالفاظ دیگر اللہ رب العزۃ کے سوا انسان کا کوئی آقا نہیں سب اس کے محکوم ہیں، دنیا کی ہر چیز اس کے واسطے بنائی گئی ہے۔ اس تعلیم کا منطقی نتیجہ تھا کہ پیروان اسلام کائنات کے سامنے بھکاری کی حیثیت سے نہیں، بلکہ شکاری کی حیثیت سے جائیں اور اس کی ظاہر و پوشیدہ قوتوں کو قابو میں کر کے اپنے مقصد کے مطابق استعمال کریں۔ اسی کا نام "تسخیر کائنات" ہے، جس کے لئے قرآن بار بار ہمت افزائی کرتا ہے:

اَلَمْ تَرَوْا اَنَّ اللّٰهَ سَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِى السَّمٰوٰتِ وَمَا فِى الْاَرْضِ وَاَسْبَغَ عَلَيْكُمْ نِعَمَهٗ ظَاهِرَةً وَّبَاطِنَةً (لقمان — ۲۰)

[کیا تم نے نہ دیکھا کہ اللہ نے تمہارے کام میں لگائے جو کچھ آسمانوں اور زمینوں میں ہیں اور تمہیں بھرپور دیں اپنی نعمتیں ظاہر اور چھپی۔]

لیکن کائنات کی زندہ اور بے جان قوتوں کی تسخیر ان سے براہ راست کشتی لڑ کر نہیں کی جا سکتی۔ یہ صرف کائنات کی پوشیدہ قوتوں کی واقفیت ہی کے ذریعہ ممکن ہے۔ اسی کا نام "علم طبیعی" اور نیچرل سائنس ہے۔ یہ حکمت مرد مومن کی متاع گم گشتہ ہے جسے وہ حسب فرمان رسول!

"كلمة الحكمة ضالة المؤمن اينما وجدها فهو احق بها"

جہاں ملے لے لینے کا حقدار ہے۔

اسی جذبے کے تحت انھوں نے یونان کا علمی و حکمی سرمایہ تلاش کیا۔ لیکن انھوں نے دوسروں کے تحقیق کئے ہوئے علوم ہی پر اکتفا نہیں کیا، بلکہ اپنے ملی سوز دروں اور حسن طبیعت سے "قُلْ رَّبِّ زِدْنِىْ عِلْمًا" کی تعلیم کے زیر اثر، ان کے اندر چار چاند لگائے اور جہاں تک اُن کے یونانی پیشرو نہیں پہونچے تھے، پہونچنے کی کوشش کی اور اکثر حالات میں پہونچ کر دم لیا۔

یہ ہے اسلامی ثقافت کا اجمالی جائزہ۔ مگر علامہ اقبال کا خیال ہے کہ اسلامی ثقافت یونانی علوم کی افادیت سے مسلمانوں کی مایوسی کا نتیجہ ہے۔ اس لئے مختلف اسلامی علوم بالخصوص علوم عقلیہ نے یونانی فکر کے خلاف مسلمان مفکرین کی ذہنی بغاوت کے نتیجہ میں ترقی کی۔ فرماتے ہیں:

"اس بات کے پیش نظر کہ قرآن کی روح ٹھوس واقعات سے اعتنا کرنا ہے اور یونانی فلسفہ کی حقیقت قیاس آرائی ہے، جو نظریات تراشی میں مگن رہتا ہے اور حقائق و واقعات سے بے اعتنائی برتتا ہے، اس کوشش کا نتیجہ ناکامی کے سوا اور کیا ہو سکتا تھا اور اس ناکامی کے نتیجے میں "اسلامی ثقافت" کی حقیقی روح منصۂ شہود پر جلوہ گر ہوئی۔

یونانی فلسفہ کے خلاف اس عقلی بغاوت کا اظہار فکر کے جملہ شعبوں میں نمودار ہوا۔ مجھے اندیشہ ہے کہ میں اس بات کی تفصیل کا اہل نہ ہو سکوں گا کہ ریاضی و ہیئت اور طب میں اس کا کس طرح ظہور ہوا۔ یہ اشاعرہ کے مابعد الطبیعی تفکیر میں بالکل واضح ہے۔ لیکن اس سے بھی زیادہ وضاحت کے ساتھ اس تنقید میں عیاں ہے، جس کے ساتھ مسلمانوں نے یونانی منطق پر تبصرہ کیا۔"

لیکن علامہ کے یہ افادات حقیقت سے مطابقت نہیں رکھتے، کیونکہ:

الف۔ یونانی پیشروؤں سے مسلمان فضلاء کا اختلاف "بغاوت" نہیں تھا، بلکہ اُن کی دریافتوں پر اصلاح و ترقی کے مترادف تھا۔

ب۔ اشاعرہ کے مابعد الطبیعی تفکیر یونانی فلسفہ کے خلاف بغاوت کا نتیجہ نہیں تھی۔ بلکہ یہ نتیجہ تھی اُس عہد کے "تکافوء ادلہ" اور خود امام اشعری کی "سخت پسندی" کا۔

ج۔ مسلمانوں کی منطق جو شیخ بوعلی سینا کے زمانہ سے "سلم العلوم" کے متاخر شراح اور ان کی شروح کے محشیوں کے زمانہ تک رائج رہی، یونانی (ارسطاطالیسی) منطق کی تنقید نہیں ہے، بلکہ اس کی توضیح ہے۔ رہی ارسطاطالیسی منطق (اور اسی طرح دوسرے فلسفیانہ علوم) پر تنقید و نکتہ چینی تو یہ کام ارسطو کے باغیوں نے نہیں کیا۔ یہ کارنامہ تھا دوسرے متبادل حریفانہ نظامہائے فکر کے علمبرداروں کا۔

مزید تفصیل حسب ذیل ہے :

(الف) تعجب ہے علامہ ایک بالغ النظر فلسفی ہونے کے باوجود EVOLUTION اور REVOLUTION میں امتیاز کی کماحقہ مراعاۃ نہ کرسکے۔ کسی علم کے EVOLUTION یا ترقی وارتقا میں ہر منزل پر اس کے بنیادی مقدمات جوں کے توں برقرار رہتے ہیں۔ لیکن جب اُس میں REVOLUTION یا انقلاب آتا ہے تو پچھلی منازل کے بنیادی مقدمہ کو مسترد کردیا جاتا ہے اور اس کے بجائے اس کے مخالف یا متضاد بنیادی مقدمہ کو اساسی حیثیت دے دی جاتی ہے۔ اس حیثیت سے فضلائے اسلام کی علمی کاوشیں یونانی علوم کے ارتقا وترقی کا دوسرا نام ہیں، کیونکہ انھوں نے ان علوم کے بنیادی مقدمات کو کبھی معرض بحث میں لانے کی جرأت نہیں کی۔

مثلاً ہیئت میں یونانی فلکیات کا بنیادی اصول یہ ہے کہ زمین کائنات کے مرکز میں واقع ہے اور تمام اجرام سماوی اس کے گرد چکر لگاتے ہیں۔ احمد بن محمد النہاوندی (جو ہارون الرشید کے عہد میں تاریخ اسلام کی پہلی رصدگاہ جندی سابور کا متولی تھا، زمانہ آٹھویں صدی مسیحی کا آخر) کے وقت سے لے کر "زیج محمد شاہی" کے مرتبین کے وقت تک (زمانہ اٹھارویں صدی مسیحی) جملہ مسلمان ہیئت دان اسی اصول پر عمل پیرا رہے۔ ترقی انھوں نے اس علم کو ضرور دی مگر یہ ترقی "ارتقا" یا EVOLUTION کی مصداق تھی۔

انقلاب یا REVOLUTION کی مثال کوپرنیکس کا جدید ہیئتی نظام ہے جو ارسطا طالیسی۔ بطلیموسی "ارض مرکزی نظریہ" کے برخلاف اس اصولی نظریہ پر قائم ہے کہ زمین ساکن نہیں، بلکہ متحرک ہے اور دوسرے اجرام سماوی کے ساتھ ساتھ سورج کے گرد چکر لگاتی ہے [اور یہ نظام شمسی کسی اور مرکز کے گرد]

اسی طرح یونانی طب کا بنیادی اصول "نظریۂ اخلاط" تھا۔ یہی اصول شروع سے آخر تک تمام مسلمان اطبا کی طبی کاوشوں کا مبنیٰ علیہ بنا رہا۔ انھوں نے فن طب میں جو بھی ترقی کی وہ قدیم یونانی طب کا ارتقا اور تسلسل تھی۔ طب میں "انقلاب" یا REVOLUTION یورپ میں آیا، جب

وہاں کے ماہرین نے "نظریہ اغلاط" کو مسترد کر کے اس کی جگہ "بیکٹیریا" یا "نظریۂ جراثیم" کو دیدی۔ یورپ کے ڈاکٹروں نے جو کچھ کیا اُسے بجا طور پر یونانی طب کے خلاف "بغاوت" سے تعبیر کیا جاسکتا ہے، مگر مسلمانوں کی کاوشوں کو اس نام سے تعبیر کرنا "وضع الشئ فی غیر محلہ" ہوگا۔

(ب) اشاعرہ امام ابوالحسن الاشعریؒ کے پیرو ہیں جو پہلے خود ایک بہت بڑے معتزلی تھے، لیکن بعد میں اعتزال سے تائب ہوگئے اور اہل السنت والجماعت میں آملے۔ ان کی یہ توبہ اعتزال سے تو بغاوت کہی جاسکتی ہے۔ مگر اعتزال "CLASSICALISM" یا "یونان پسندی" کا نام نہیں تھا، بلکہ واقعہ یہ ہے کہ اسے خود یونانی فلسفہ کے ردّ و ابطال کا بہت بڑا شرف پہونچتا ہے۔ امام اشعری نے معتزلہ سے "رویت باری کے انکار" "کلام باری کے مخلوق ہونے کے عقیدے" "المنزلۃ بین المنزلتین" وغیرہ مسائل میں بغاوت کی تھی۔ مگر جہاں تک یونانی فلسفہ کے نقض و تردید کا تعلق ہے، اس باب میں وہ اپنے معتزلی پیشروؤں کے مخالف فلسفہ تنقیدی سرگرمیوں کا پورا ورثہ لے کر تائب ہوئے تھے۔ اشاعرہ کے یہاں یونانی فلسفہ سے جو کچھ اختلاف ہے، اس میں ان ذاتی کاوشوں کا دخل نہیں ہے۔ اور متاخر اشاعرہ نے فلسفہ کا اگر کوئی ردو ابطال کیا تو یہ شیخ بوعلی سینا کا فلسفہ تھا۔ مگر علامہ اقبال ہوں یا ان کے انداز فکر پر سوچنے والے دیگر متجددین عہد، بوعلی سینا کی کاوشوں کو قطعاً ایتکار فکر سے تہی دامن سمجھتے ہیں۔ لہٰذا اگر وہ امام غزالی یا امام رازی کے نقوض و ردود کو ارسطو کی تنقید سمجھ لیں تو معذور ہیں۔

(ج) لیکن منطق کے متعلق علامہ نے بڑے وثوق سے فرمایا ہے:

"لیکن یونانی فلسفہ کے خلاف یہ عقلی بغاوت سب سے زیادہ وضاحت کے ساتھ اُس تنقید میں عیاں ہے، جس کے ساتھ مسلمانوں نے یونانی منطق پر تبصرہ کیا۔"

یونانی منطق سے مسلمان فضلاء کے اختلاف نے دو شکلیں اختیار کی تھیں:

پہلی شکل کھلی ہوئی مذمت کی تھی۔ یہ محدثین کرام کا مسلک تھا جو شروع ہی سے غیر اسلامی افکار کو "بدعت" اور ہر بدعت کو "کل بدعۃ معصیۃ وکل معصیۃ فی النار" سمجھتے تھے۔ اس

گروہ میں محدث ابن صلاح، حافظ ابن تیمیہؒ اور امام سیوطی خصوصیت سے قابل ذکر ہیں مگر یہ حضرات یا ان کے اسلاف یونانی منطق (وفلسفہ) کے پیروکیب تھے، جو ان کی مذمت اور مخالفت کو "بغاوت" کہا جا سکے۔

دوسری شکل منطق کی علمی اور سائنٹفک تنقید تھی۔ اس سلسلے میں چار مکاتب فکر آتے ہیں:

۱۔ متکلمین

۲۔ اشراقیین

۳۔ بعض مشائین (ارسطاطالیسی فلسفہ کے پیرو) جیسے ابو البرکات بغدادی اور

۴۔ بوعلی سینا کے مخالف ناقدین جیسے ابن رشد، عبداللطیف بغدادی، نجم الدین نخجوانی وغیرہ۔

متکلمین اور اشراقیین کا منطق کے بارے میں پہلے ہی سے اپنا اپنا مستقل نظام تھا جو یونانی منطق سے بالکل آزاد رہ کر، بلکہ ارسطاطالیسی منطق کے مسلمانوں میں رائج ہونے سے پہلے ہی منظم ہو چکا تھا۔ یہ دونوں گروہ یونانی، ارسطاطالیسی منطق کے پیرو ہی نہیں رہے۔ لہٰذا ان کی مخالفت کو یونانی منطق سے بغاوت کس طرح کہا جا سکتا ہے۔ یہ تو اپنے اپنے مکتب فکر کے تفوق کی کوشش تھی۔

اسی طرح ابن رشد اور عبداللطیف بغدادی وغیرہ کی تنقیدی سرگرمیاں بوعلی سینا کے خلاف تھیں۔ ارسطو کے خلاف نہیں تھیں۔

اب لے دے کے صرف ابو البرکات بغدادی کا نام رہ جاتا ہے۔ اس نے "کتاب المعتبر" میں قدیم منطق کے مسلمات پر ضرور ایرادات وارد کئے ہیں اور بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ وہ ارسطو کے خلاف بغاوت کر رہا ہے مگر قاضی نور اللہ شوستری نے محقق طوسی کی تعریف میں جو کچھ لکھا ہے اس سے ایسا اندازہ ہوتا ہے کہ ابو البرکات کی یہ تنقید بھی شیخ بوعلی سینا کے خلاف تھی۔ قاضی نور اللہ

محقق طوسی کی تعریف میں لکھتے ہیں:

"معالم تحقیقات ابوعلی را کہ بتصادم شبہات ابوالبرکات بودی وتشکیکات فخرالدین رازی نزدیک باندراس رسیدہ بود، از غایت غلو حکمت و کمال ادراک استدراک نمود۔"

(مجالس المؤمنین صفحہ ۳۳۹)

غرض اسلام میں منطق کی ترقی، جو نام ہے متاخرین کے متقدمین سے اختلاف کرنے کا یا معاصرین کے حریفانہ تصادمِ افکار کا، تمام تر یونانی منطق کے خلاف عقلی بغاوت کا نتیجہ نہیں تھی، بلکہ بہت کچھ متبادل حریفانہ نظامہائے فکر کے اصطدام آرا نیز خود مسلمان منطقیوں کی باہمی چشمک پر مشتمل تھی۔

(۴) دنیائے ریاضیات کے سکون میں محقق طوسی کے تلاطم برپا کرنے کا معروضہ | ریاضیات میں مسلمانوں کی سرگرمیوں کے بارے میں

علامہ نے حسب ذیل وضاحت فرمائی ہے:

"جہاں تک ریاضیات کا تعلق ہے، یہ یاد رکھنا چاہئے کہ بطلیموس (۸۷ - ۱۶۵ء) کے زمانہ سے نصیر طوسی (۱۲۰۱ — ۱۲۷۴ء) کے زمانہ تک کسی نے بھی ان دقتوں کی طرف سنجیدگی سے غور نہیں کیا جو (اصول) اقلیدس کے خطوط متوازی کے مصادرے کی صحت کو مکان حسی کی بنیاد پر ثابت کرنے میں مضمر ہیں۔ یہ (محقق) طوس ہی کی ذات تھی جس نے اس سکون میں جو ہزار سال سے دنیائے ریاضیات پر طاری تھا، تلاطم برپا کیا۔ محقق طوسی نے اس مصادرے کی اصلاح کی کوشش میں مکان کے حسی تصور کو ترک کرنے کی ضرورت کا احساس کیا۔ اس طرح انھوں نے ہمارے زمانہ کی فضائے کثیر الجہات کی تحریک کے لئے ہر چند کہ وہ کتنی ہی معمولی کیوں نہ ہو، بنیاد فراہم کی۔"

علامہ کا یہ ارشاد تین دعووں پر مشتمل ہے:

الف۔ ریاضیات کی دنیا پر بطلیموس کے زمانہ سے جو سکون طاری تھا، محقق طوسی نے پہلی مرتبہ

اس میں تلاطم برپا کیا

ب۔ اقلیدس کے "مصادرہ متوازی خطوط" کی اصلاح کے واسطے محقق طوسی نے مکان کے روایتی تصور کو ترک کر کے نیا تصور پیش کیا۔

ج۔ محقق طوسی نے اس نئے تصور مکان کے ذریعہ عہد حاضر کی "فضائے کثیر الجہات" کی تفکیر کا افتتاح کیا۔

لیکن علامہ کے یہ افادات ناقابلِ تسلیم ہیں۔ ایسا اندیشہ ہوتا ہے کہ اتنے اہم مسئلے کے حل میں انھوں نے اس ذمہ داری کو ملحوظ نہیں رکھا جو ان جیسے بالغ النظر محقق سے بجا طور پر متوقع کی جاتی تھی۔ اس کے برعکس انھوں نے انتہائی سطحی معلومات جو غالباً انھیں مستشرقین کی "تحقیقاتِ انیقہ" سے حاصل ہوئی تھیں، اعتماد کر لیا۔

مزید تفصیل حسب ذیل ہے:

(الف) علامہ نے ریاضیات کی دنیا کے جس سکون و تلاطم کا ذکر کیا ہے، اس کی کیفیت یہ ہے:

اصول اقلیدس کی بنیاد چند علوم متعارفہ، اصول موضوعہ اور کچھ مصادرات پر ہے۔ ان میں سب سے زیادہ معرکۃ الآرا اقلیدس کا پانچواں مصادرہ تھا جو "خطوط متوازی کا مصادرہ" بھی کہلاتا ہے۔ اقلیدس نے اسے "مصادرہ" قرار دیا تھا، مگر بعد کے لوگوں نے اسے "شکل اثباتی" کہا اور دیگر اشکال کی طرح اسے بھی ثابت کرنے کی کوشش کی۔ یورپی ماہرین تاریخ ریاضیات کا خیال ہے کہ یونانیوں میں آخری شخص جس نے یہ کوشش کی وہ بطلیموس (۸۷۔۱۶۵ء) تھا۔ اس کے بعد بقول ان یورپی فضلاء کے نہ تو کسی یونانی ریاضی داں نے پانچ سو سال (بعثت اسلام) تک یہ کوشش کی اور نہ محقق طوسی سے پہلے کسی مسلمان ریاضی داں نے۔ اس طرح بطلیموس کے ہزار گیارہ سو سال بعد تک دنیائے ریاضیات پر، بقول فضلائے یورپ کے ایک جمود طاری رہا تا آنکہ ساتویں صدی ہجری (تیرھویں صدی مسیحی) کے وسط میں محقق طوسی نے اس مصادرے کو ثابت کرنے کی کوشش کی۔

[لیکن مستشرقین اور دیگر مورخین ریاضیات نے خود محقق طوسی کے پیش کردہ "خطوط متوازی کے مصادرہ" کے ثبوت کے بیان میں جو گل فشانیاں فرمائی ہیں، خوف تطویل اس کی تفصیل سے مانع ہے۔ مختصراً اتنا سمجھنا کافی ہوگا کہ سب سے پہلے یورپی فاضل نے جس کے پاس ۱۵۹۵ء میں اصول اقلیدس کا مطبوعہ نسخہ تبصرہ کے لئے بھیجا گیا تھا، اس کے بارے میں فرمایا تھا:

"وہ اس کتاب کے بارے میں صرف اتنا ہی کہہ سکتا ہے، جتنا کوئی شخص اس کتاب کے بارے میں کہنے کا مجاز ہے جسے اس نے کبھی نہیں پڑھا۔"

اس سے بعد کے لال بجھکڑوں کی گل فشانیوں کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے ع

قیاس کن زگلستانِ من بہار مرا]

بہرحال یورپی فضلاء ہوں یا ان کے مقلد علامہ اقبال، واقعہ یہ ہے کہ محقق طوسی سے پہلے کم از کم دس مسلمان ریاضی دانوں نے سنجیدگی کے ساتھ اس مصادرے کو ثابت کرنے کی کوشش کی تھی۔ ان میں سے تین ریاضی دانوں عباس بن سعید الجوہری، ابن الہیثم اور عمر خیام کی کاوشوں کا تفصیلی طور پر خود محقق طوسی نے اپنی کتاب "الرسالۃ الشافیہ" میں ذکر کیا ہے۔ عمر خیام کی "شرح ما اشکل من مصادرات اقلیدس" جس میں اس نے اس مصادرہ کا ثبوت دیا ہے شائع ہوگئی ہے۔ ابن الہیثم کی "شرح مصادرات اقلیدس" اور "حل شکوک اقلیدس" جن میں اس نے "خطوط متوازی کے مصادرہ" کا بدل پیش کیا ہے، ابھی مخطوطہ کی شکل میں موجود ہیں۔ مقدم الذکر کے نسخے آکسفورڈ، فیض اللہ (الجیریا) اور رضا لائبریری رامپور میں موجود ہیں۔ موخر الذکر کا ایک نسخہ اسلامیہ کالج پشاور کی لائبریری میں موجود ہے۔

غرض ان ریاضی دانوں میں قدیم ترین نام عباس بن سعید الجوہری کا ہے، جس نے ۸۳۰ھ کے قریب اس مصادرہ کا ثبوت دیا تھا، یعنی محقق طوسی سے ساڑھے چار سو سال پہلے۔

(ب) محقق طوسی کا نیا "تصور مکان" "اقلیدس کے "خطوط متوازی کے مصادرہ" سے کوئی تعلق

نہیں رکھتا۔ انھوں نے بھی اپنے پیشرو حلی کی طرح اس مصادرہ کو "مکان حسی" ہی کی بنیاد پر ثابت کرنے کی کوشش کی تھی۔

یہ امر بھی قابل ذکر ہے کہ جس چیز کو علامہ اقبال محقق طوسی کا "نیا تصورِ مکان" بتاتے ہیں وہ "بُعد مجرد" کا تصور تھا۔ مگر اس کی دریافت کا شرف اولیت بھی محقق طوسی کو نہیں پہونچتا، بلکہ ان کے پیشروؤں کو پہونچتا ہے۔ چنانچہ محقق طوسی کے رمز شناس شاگرد و شارح علامہ حلی نے محقق طوسی کی "تجرید الکلام" کی شرح میں لکھا ہے کہ محقق طوسی سے پہلے ہی افلاطون اور ابو البرکات بغدادی کا مذہب رہ چکا ہے:

"الذی علیہ المحققون امران: احدھما البعد المساوی لبعد المتمکن وھذا مذھب افلاطون..... وقد اختار المصنف الاول وھو اختیار ابی البرکات"۔
(شرح تجرید از علامہ حلی: بحث مکان)

جس امر پر محققین کا اتفاق ہے، وہ دو باتیں ہیں: یا تو (مکان نام ہے) اُس بعد (مجرد) کا جو متمکن کے مساوی ہو اور یہ افلاطون کا مسلک ہے..... اور مصنف (محقق طوسی) نے اس پہلے مذہب کو اختیار کیا ہے اور اس مذہب کو اُن سے پہلے ابو البرکات بغدادی نے اختیار کیا تھا۔

(ج) محقق طوسی کے اس منفرد "تصور مکان" اور اسی طرح اُن کے "خطوط متوازی کے مصادرہ" کے اثبات کی کوشش کا عہد حاضر کی "فضائے کثیر الجہات کی تحریک" سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

لیکن اس کی تفصیل ایک جداگانہ اور مستقل پیش کش کی مقتضی ہے۔

یہ ایک مختصر جائزہ ہے علامہ کی گفتاریوں کا۔ لیکن اگر دقتِ نظر کے ساتھ اس کے اسباب و علل کا تجزیہ کیا جائے تو اس کی تہہ میں دو عامل کارفرما نظر آئیں گے۔

۱۔ یورپی ثقافت کی عظمت و برتری سے ذہنی مرعوبیت: اس کا نتیجہ ہے کہ وہ یورپی تہذیب کی ہر مزعومہ خوبی اور اُس کے ہر انفرادی وصف کو قرآن اور اسلام کی بنیادی تعلیم قرار دیتے ہیں۔ اوپر ذکر آچکا ہے کہ اسپنگلر نے جدید یورپی تہذیب کا اصل الاصول "کلاسیکیت بیزاری"

"ANTI - CLASSICALISM" بتایا ہے۔ علامہ نے بھی قرآنی تعلیمات کی روح کو اس کی "کلاسیکیت بیزاری" میں منحصر فرمادیا ہے۔

اسی طرح اسپنگلر نے یورپی تہذیب کی انفرادیت کا راز "زمانہ کے احساس شدید" میں مضمر بتایا تھا، علامہ بھی خواہی نخواہی اسے قرآن کریم کی بنیادی تعلیم قرار دیتے ہیں۔

۲۔ مگر اس سے زیادہ بنیادی سبب اسلامی فکر کے "ORIGINAL SOURCES" کے بجائے مستشرقین اور دیگر فضلائے مغرب نے اس کی جو توجیہ و تعبیر کی ہے، اس پر ان کا غیر مشروط اعتماد ہے، اس کی مثال ابھی گزری۔ "معاصرہ توازی خطوط" کا اثبات یا اس کے بدل کی تلاش قدیم و جدید ماہرین علم الہندسہ کا بڑا محبوب علمی مشغلہ رہا ہے۔ لیکن مورخین ریاضیات نے اس ضمن میں مسلمانوں کے اندر صرف ایک ہی فاضل کا نام گنایا ہے اور وہ ہے، محقق نصیر الدین طوسی حالانکہ خود محقق طوسی نے اپنے فاضلانہ رسالہ "الرسالۃ الشافیہ" میں اپنے سوا تین اور ہندسین اسلام کے نام گنائے ہیں، جنھوں نے اس مسئلہ پر بڑی سنجیدگی سے غور و خوض فرمایا تھا مگر علامہ کی عجلت فرمائی نے اس مسئلہ کے اصل اور معتمد علیہ ماخذ کے بجائے مستشرقین و فضلائے مغرب کی "تحقیقات انیقہ" ہی پر تکیہ فرمالیا۔ اور پھر اس پر اس شدت کے ساتھ اصرار کیا کہ محقق طوسی کے پیشرو مسلمان ماہرین علم الہندسہ کی ساری ہندسی تحقیقات کالعدم ہوگئیں۔

یہ اس عاجز ہی کی رائے نہیں ہے بلکہ دیگر فضلائے عہد کا بھی یہی خیال ہے۔ چنانچہ علامہ کے استاد بھائی پروفیسر ایم ایم شریف صاحب سابق پرو وائس چانسلر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ علامہ کی مشہور کتاب

"DEVELOPMENT OF METAPHYSIC IN PERSIA"

کے نئے اڈیشن کے تعارف میں، جسے کچھ دن ہوئے بزم اقبال لاہور نے شائع کیا تھا، فرماتے ہیں:

"IN HIS OBSERVATIONS REGARDING AL FARABI, IBNE - MASKWAIH AND IBNE-SINA HE HAS

MORE OR LESS ECHOED THE VIEWS OF EARLY WESTERN ORIENTALISTS AND HAS DENIED THESE GREAT THINKERS THE CREDIT FOR ORIGINALITY AND DEVATION FROM NEO-PLATONIOM.

THERE IS NO DOUBT THAT IF HE WERE TO REWRITE THE WORK, HE WOULD HAVE DIFFERENTLY EVALUATED THEIR PHILOSPHICAL EFFORTS."

[فارابی، ابن مسکویہ اور ابن سینا پر اقبال کا تبصرہ کم و بیش مستشرقین مغرب کے آراء کی صدائے بازگشت ہے۔ انھوں نے ان مفکرین عظام کو اس شرف سے محروم کر دیا ہے جس کے وہ اپنے کارِ فکر اور نو فلاطونیت سے انحراف کی بنا پر مستحق تھے]

ان عوامل کا نتیجہ ہے کہ علامہ کے افادات بعض اوقات بڑی مضحکہ خیز شکل اختیار کر لیتے ہیں۔ وہ اسلامی فکر کے اساطین کے کام تو درکنار ان کے نام بھی صحیح طور پر پیش نہیں کر پاتے۔ متاخر مفکرین اسلام میں میر باقر داماد اور ان کی "الافق المبین" خاص شہرت کے حامل ہیں۔ وہ صدرائے شیرازی (مصنف "شرح ہدایہ الحکمہ" یا "صدرا") کے اُستاد تھے۔ تصور زماں کے سلسلے میں اُن کا نظریہ "حدوث دہری" خاص اہمیت رکھتا ہے جس سے ملا محمود جونپوری نے "شمس بازغہ" میں سخت اختلاف کیا ہے۔ یہ (حدوث دہری کا نظریہ) میر باقر داماد کا خاص کارنامہ ہے۔ ویسے اس سلسلہ میں انھوں نے افلاطون کا قول بھی نقل کیا ہے کہ زمانہ فلک کے ساتھ وجود میں آیا ہے۔

مگر علامہ ہیں کہ میر باقر داماد کے کام کی ترجمانی تو درکنار، ان کے "نام" سے بھی صحیح طور پر واقف

معلوم نہیں ہوتے اور انتہائی مضحکہ خیز طور پر ایک "میر باقر داماد" کی واحد شخصیت کی دو شخصیتیں "ملا باقر" اور "میر داماد" بنا دیتے ہیں اور پھر ان دونوں خود ساختہ شخصیتوں کے لئے بصیغہ جمع ضمیر "THEY" استعمال فرماتے ہیں۔ فیاللعجب۔

اس سے زیادہ افسوسناک اُن مدعیان تصوف کی ذہنیت ہے جن کی کورانہ عقیدت مندی تلخ حقائق کو سن کر تلملا اٹھتی ہے اور سنجیدہ علمی تحقیق و تنقید کے بجائے جھلا کر اطالت لسان کا سہارا ڈھونڈ لیتی ہے۔ شاید انھیں یہ بھی معلوم نہ ہو کہ اسی اقبال نے جب انتہائی بیدردی کے ساتھ ان کے تصوف بالخصوص عقیدۂ وحدت الوجود کے پرخچے اُڑائے تھے تو بڑی بڑی خانقاہوں میں زلزلہ آگیا تھا۔

انتخاب الترغیب والترہیب

مولفہ حافظ محدث ذکی الدین المنذریؒ ترجمہ مولوی عبد اللہ صاحب دہلوی

اعمال خیر پر اجر و ثواب اور بدعملیوں پر زجر و عتاب پر متعدد کتابیں لکھی گئی ہیں۔ لیکن اس موضوع پر المنذری کی اس کتاب سے بہتر کوئی کتاب نہیں ہے۔ اس کے متعدد تراجم وقتاً فوقتاً ہوئے مگر نامکمل ہی شائع ہوئے۔ کتاب کی افادیت اور اہمیت کے پیش نظر اس کی ضرورت تھی کہ اس میں سے مکررات کے اعتبار سے کمزور حدیثوں کو نکال کر اصلی متن تشریحی ترجمہ اور حواشی کے ساتھ ملا کر طبع کرایا جائے۔ ندوۃ المصنفین دہلی نے نئے عنوانوں اور نئی ترتیب کے ساتھ شائع کرنے کا پروگرام بنایا ہے جس کی پہلی جلد آپ کے سامنے ہے۔

صفحات ۴۵۰ قیمت -/۱۲ مجلد -/۱۳

ملنے کا پتہ: ندوۃ المصنفین۔ اردو بازار۔ جامع مسجد دہلی ۶